قرآن اپنے متعلق کیا کہتا ہے؟

از جناب مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

قرآن حکیم، خدا کا آخری پیغام ہے، بین الاقوامی اخوت کا علمبردار، کائناتِ انسانی کی رشد وہدایت کا منادا، اور دینی ودنیوی سعادت وفلاح کا کفیل ہے وہ ہر ایک شعبہ زندگی کا مصلح ہے اور ہر ایک گوشہ حیات کے لئے مشعلِ راہ۔ یہ ہمارا عقیدہ ہے، ہمارا ایمان ہے اور ہمارے ایقان واذعان کا سنگِ بنیاد ہے اور یہی نہیں بلکہ کائناتِ مذہب وملت اور عالم روحانیات کے دلائل ونظائر اور شواہد وبراہین اس پر ناطق وشاہد ہیں۔

تاہم یہ سوال اپنی جگہ پر اہم ہے کہ خود قرآن کریم اپنے متعلق کیا کہتا ہے اور اُن تمام اوصاف کمالات کے بارہ میں ——— جن کا ذکر سطورِ بالا میں ہوا ہے ——— خود اس کا اپنا فیصلہ اور اس کی اپنی اندرونی شہادت کیا ہے؟

اس سوال کی اہمیت خصوصیت کے ساتھ اس لئے بھی بہت زیادہ وزن رکھتی ہے کہ قرآن حکیم کا دعوٰی یہ ہے کہ وہ کسی بزرگ سے بزرگ تر انسان کا بھی کلام نہیں ہے بلکہ خدائی قانون اور "کلام اللہ" ہے۔

کون نہیں جانتا کہ صفت، ذاتِ موصوف کے ساتھ اس طرح وابستہ ہوتی ہے کہ موصوف کے تمام شئون وکیفیات صفت کے شئون وکیفیات بن جاتے ہیں۔ صوفیائے کرام میں ہمہ اوست اور ہمہ از وست کی بحثیں اسی ربط اور وابستگی نے پیدا کیں اور وحدۃ الوجود، وحدۃ الشہود اور تنزیہہ کے نازک اور فلسفیانہ مسائل اور "لاعین ولاغیر" کے کلامی دقائق اسی ربط واتصاف کے رہین منت ہیں۔

پس جبکہ اللہ تعالیٰ ہر نقص و عیب سے پاک اور منزہ ہے تو از بس ضروری ہے کہ اس کا کلام بھی ہر قسم کے نقص و عیب سے بالاتر اور کامل و مکمل ہو۔ نیز وہ باہر کی شہادتوں اور خارجی دلیلوں سے بے نیاز اپنی حیثیتِ کمال کو خود ہی بدرجۂ اتم و اکمل ظاہر کرتا ہو تاکہ کائناتِ انسانی اس کے دعوٰی کو اسی کی پیش کردہ دلائل و براہین کی کسوٹی پر کس کر اس کی صداقت کا امتحان کرنے میں حق بجانب ٹھہرے۔ اس بنا پر آج کی صحبت میں ہم اس پر بحث کرنا چاہتے ہیں کہ خود قرآن نے اپنی اس حیثیت کے بارہ میں کیا کچھ کہا ہے اور اس سے کیا مراد ہے؟

قرآنِ حکیم کی اس امتیازی خصوصیت پر قلم اٹھانے کے لئے سب سے پہلے اس حقیقت کو پیشِ نظر لانا ضروری ہے کہ جبکہ کائناتِ مذہب و ملت کا یہ طے شدہ فیصلہ ہے کہ خالقِ کائنات صرف ایک ہستی ہے اور اس وحدت میں کثرت کی مطلق گنجائش نہیں ہے اور وہ ہستی مختلف زبانوں اور تعبیروں میں "اللہ" "الوہیم" "ایل" "اہورمزدہ" اور "ایشور" کے نام سے موسوم ہے۔ اور اگر ایک موحد اور حنیفی یہ عقیدہ رکھتا ہے تو مشرک اور بت پرست بھی اس کا انکار نہیں کرتا اور اگرچہ وہ سینکڑوں اور ہزاروں بتوں، دیوتاؤں، اوتاروں کی شکل میں خدا کی ہستی کو تقسیم کرتا رہتا ہے تاہم یہ کہنے پر مجبور ہے کہ کائناتِ ہست و بود کا خالق و مالک ایک اور صرف ایک ہے۔ چنانچہ جب مشرکین عرب سے یہ دریافت کیا جاتا تھا کہ بتاؤ "زمین و آسمان کس نے بنائے؟" یہ کہو کہ "تم کو کس نے پیدا کیا؟" یہ جواب دو کہ "زمین و آسمان کا مالک کون ہے؟ اور کائنات کی حکومت کس کے قبضہ میں ہے؟" تو ان سب سوالات کا جواب وہ یہی دیتے تھے "اللہ نے سب کچھ بنایا ہے وہی تمام زمین و آسمان کا مالک ہے، وہی کائنات کا حاکم و بادشاہ ہے" گویا ان کے پاس ایک موحد کی طرح "اللہ" کہنے کے ماسوا کوئی چارۂ کار نہیں رہتا تھا۔

اس سے بھی آگے بڑھ کر یہاں تک دعوٰی کیا جا سکتا ہے کہ موحدین و مشرکین ہی نہیں بلکہ منکرینِ خدا بھی عالمِ کون و فساد کی اس کثرت میں وحدت کے معترف اور اس نیرنگی و بوقلمونی کائنات میں قدرت کی ہم آہنگی کے قائل ہیں۔ چنانچہ ایک عرصہ تک اس گروہ نے مادہ اور اس کی حرکت پر

بھروسہ کرتے ہوئے نیچر اور قانونِ قدرت کی تمام کارفرمائیوں کو اس کے سپرد کرکے یقین کرلیا تھا کہ اس تمام مادی کثرت میں بھی وحدت کارفرما ہے۔ مگر جب ان کے خدائے قدرت (سائنس) نے جوہر فرد (ایٹم) کو توڑ کے یہ ثابت کردیا کہ جس کو آج تک سائنس عنصر اور جوہر فرد سمجھتی اور اسی پر کائنات کی ہست وبود کو منحصر جانتی آئی تھی غلط محض تھا اور یہ (جوہر فرد) بھی مرکب ہے تو اب ان کو بھی اس اعتراف کے سوائے کوئی چارہ باقی نہیں رہا کہ اس عالمِ ہست وبود میں مادہ سے بالاتر کوئی وجود ہے اور اس کی یکتا اور ہم آہنگ قدرت اس کائنات پر کارفرما ہے۔

اب یہ جدابات ہے کہ خدا کے اقرار سے بچنے کے لئے اس کا نام انرجی (طاقت) رکھ لیجئے یا پردۂ فرد الٹھنے سے قبل اصل حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے براہ راست خدا اور اس کی وحدتِ قدرت کی کارفرمائی کے سامنے سرِ تسلیم خم کردیجئے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ براہِ راست خدا کا اعتراف کیجئے یا بالواسطہ اس کو دوسرے ناموں سے یاد کیجئے۔ عالمِ مادیات کے ساتھ عالمِ روحانیات کے اعتراف کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے اور ساتھ ہی یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کسی کثرت یا دوئی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کا سرچشمہ "وحدت" اور سرتاسر "وحدت" ہے خواہ اس کی قدرت کو قانونِ قدرت کہہ لیجئے یا ناموسِ فطرت یا اس کا نام نیچر رکھ لیجئے یا قرآن کی اصطلاح میں "فطرۃ اللہ" سے تعبیر کرلیجئے۔ ہر حالت میں یکرنگی، یکسانیت بلکہ "اکائی" کے ماسوا اور کچھ نہیں ہے۔

اب یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ جب اس جہان اور کائنات کا خدا ایک اور وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے تو بلاشبہ اس کا قانونِ قدرت بھی ایک ہے اور وہی قانون عالمِ مادیات میں کارفرما اور وہی کائناتِ روحانیات ومذہبیات پر جاری وساری ہے اور جس طرح اور جس حیثیت سے اس کا قانونِ فطرت مادیات کے لئے دلیل راہ بن سکتا ہے اسی طرح روحانیات کے لئے بھی مشعلِ راہ ثابت ہوسکتا ہے کہ یہی قادرِ مطلق کی وحدتِ قدرت پر روشن دلیل اور قوی برہان ہے۔

اس مختصر مگر حقیقت افروز تمہید کے بعد ہمارے لئے آسان ہوجاتا ہے کہ قرآنِ حکیم نے اپنے

متعلق جو کچھ کہا ہے اس کو نوامیسِ الہیہ کے قانونِ وحدت کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کے حق وصداقت کا امتحان کریں اور "وحی الٰہی" کے دعوٰی کی حقانیت کو آزمائیں۔

الکتاب اور ھُدیٰ | قرآنِ عزیز نے سورۂ بقرہ کی پہلی آیت میں خود کو دو اسمارِ صفات کے ذریعہ روشناس کرایا ہے یعنی وہ "الکتاب" ہے اور "ھُدٰی" ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے "الٓمّٓ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ۔ الم۔ یہ "الکتاب" ہے اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے۔ یہ متقیوں کے لئے "ھدی" ہادی وراہنما ہے۔"

قرآنِ عزیز، کتاب ہے اس لئے کہ وہ تحریر میں لائی جا سکتی ہے اور تحریر میں لائی جاتی ہے اور "مابین الدفتین" لکھی ہوئی نظر آتی ہے، وہ کتاب کیوں ہے؟ اس لئے کہ جب اس عالمِ ہست و بود پر فکرِ بلند سے نظر ڈالئے تو یہ بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ حضرتِ انسان تمام موجودات کے مقابلہ میں جن خصوصیات کا حامل ہے اور جو خصائص اس کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہیں ان میں سب سے زیادہ وقیع یہ خصوصیت ہے کہ انسان کی فطرت مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے ایک اجتماعی نظام کو چاہتی ہے کہ اس کے بغیر جوہرِ انسانیت رونما نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اگر کسی نظام کے بغیر زندگی بسر کرے تو اس کے اور حیوانات کی زندگی کے درمیان کوئی ایسا امتیاز باقی نہیں رہ سکتا جو اس کے جوہرِ انسانیت کو نمایاں کر سکے اور وہ بھی وحشی حیوانوں یا پالتو جانوروں کی طرح ایک بولتا (ناطق) ہوا حیوان ہو کر رہ جائے گا۔

اور یہ نظام جب عقل کی راہنمائی میں انسانی دماغوں اور دماغی کاوشوں سے عالمِ وجود میں آتا ہے تو "دستور" "آئین" اور "قانون" کہلاتا ہے اور مادی ترقیات کے ارتقائی منازل میں ہڈیوں ٹھیکریوں، کھالوں، پتھروں، بھوج پتروں اور کاغذوں پر لکھا جا کر کتاب دستور وآئین کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔

یہی وہ دستور وآئین ہے جس کے پیشِ نظر اقوامِ انسانی کے زمانہ ہائے تاریخ کو تنزل سے ترقی اور پستی سے بلندی کی جانب گامزن بتلایا جاتا اور ہر دور تاریخی کو ایک دوسرے سے موازنہ کر کے

قوموں کی پستیٔ فکر و تنگیٔ نظر یا بلندیٔ فکر و وسعت نظر کا فتویٰ صادر کیا جاتا اور اقوام کی ذہنی پستی و بلندی کے لئے معیار قرار دیا جاتا ہے۔

لیکن عقل سلیم اور فطرتِ مستقیم یہ بھی راہنمائی کرتی ہے کہ جبکہ انسانی وساتیر و قوانین خود انسانوں کے اپنے دماغوں کی کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں تو اس لئے انسانوں کے جذباتِ رقابت اس کو گوارا نہیں کرتے کہ وہ اپنے ہم جنس کے بنائے ہوئے قوانین کو اپنے لئے اٹل اور ناگزیر سمجھیں چنانچہ حکومتوں کے انقلابات اس جذبہ کی غمازی کرتے رہتے ہیں اور ایک ہی حکومت کے نت نئے احکامات اور قوانینی تغیرات اس حقیقت کو بے نقاب بناتے رہتے ہیں حتیٰ کہ خود ایک قوم کے اندر بھی پارٹیوں کا تصادم ایسی رقابت کا رہینِ منت نظر آتا ہے اس لئے از بس ضروری ہے کہ کوئی ایسا نظام منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو جو انسانی عقل و فکر کی رقابتوں سے بالاتر خدائے کائنات کی جانب سے نازل ہو کر عقل و فکر کی رہنمائی کرے اور جو فطرت کی مطابقت و ہم آہنگی سے بھی سرِ مو متجاوز نہ ہو۔

نیز فطرتِ عالم اور قانونِ قدرت کا تقاضا ہے کہ اس کائنات کا اگر ایک ہی خالق و مالک ہے تو بین الاقوامی اتحاد اور عام اخوتِ انسانی کے پیشِ نظر از بس ضروری ہے کہ ملکوں، قوموں، قبیلوں اور جرگوں کے جدا جدا قوانین اور رقیبانہ کشمکش کے حریفانہ وساتیر و آئین کی جگہ خالق کائنات کی جانب سے ایک ایسا دستور اور ایسی کتابِ آئین موجود ہو جس کے اساسی اور بنیادی قوانین اخوتِ عام اور انسانیتِ کامل کا سبق دیتے ہوں اور تمام عالمِ انسانی اس کی روشنی میں اپنی زندگی کا لائحہ عمل مرتب کر کے جوہرِ انسانیت کے طغرائے امتیاز کا ثبوت بہم پہنچا سکے۔

وہ کسی انسان کی جانب منسوب نہ ہو کہ نوعِ انسانی کی باہمی رقابت کا شکار بن کر بربہمی نظام کا باعث ہو جائے اور اس کی تعلیم کسی جغرافی، ملکی اور نسلی امتیازات کے اندر محدود نہ ہو کہ عالمگیر اخوت کی بجائے وطنی رقابت کی داعی بن جائے اور اقوام کے مابین آویزش و کشمکش کی بنیاد ثابت ہو۔

قرآن عزیز اسی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے کہتا ہے کہ میں خدا کی جانب سے "کتاب" دستور و آئین ہوں اور انسانی دماغوں اور دماغی کاوشوں سے بالاتر خدائے انسانیت کا عالمگیر قانون ہوں۔ پس اگر تم دنیوی اور مادی نظام کو برقرار رکھنے کے لئے خود ساختہ قوانین اور کتاب دستور و آئین کے محتاج ہو تو بلاشبہ مادی اور روحانی نظام میں فطری مطابقت پیدا کرنے اور جوہرِ انسانیت کو بلند سے بلند تر بنانے کے لئے ایسے دستور و آئین اور کتاب قوانین کے محتاج ہو جو انسانی رقابتوں، قومی عصبیتوں اور ملکی و نسلی عداوتوں سے بالاتر "خدائی کتاب" اور "الٰہی قانون" ہو کر کائناتِ انسانی کے سامنے آئے۔

پس قرآن کہتا ہے کہ میں وہی کامل و مکمل "کتاب" ہوں۔ "کتاب" عربی لفظ ہے جس کے متعدد معانی ہیں، یہ "فرض" کے معنی میں آتا ہے

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۔	بلاشبہ نماز ہے مومنوں پر فرضِ موقت۔

اور "حجت و برہان" کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔

فَاْتُوْا بِکِتٰبِکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ	اگر تم سچے ہو تو لاؤ اپنی دلیل اور حجت

اور اس کا اطلاق "مدت" پر بھی ہوتا ہے۔

وَمَآ اَھْلَکْنَا مِنْ قَرْیَۃٍ اِلَّا وَلَھَا کِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ۔	اور ہم نے کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر یہ کہ اس کے لئے مدت معین ہو چکی تھی۔

اور یہ اس تحریر پر بھی بولا جاتا ہے جو آقا اور غلام کے درمیان بدلِ کتابت کے سلسلہ میں لکھی جاتی ہے

وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْکِتٰبَ مِمَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ۔	اور غلام باندیوں میں سے وہ جو (بدل کتابت کے لئے) چاہتے ہیں تحریر۔

مگر یہ تمام اطلاقات دراصل ایک ہی بنیادی معنی سے وابستہ ہیں اور وہ یہ کہ کتاب کے معنی "لکھنا یا لکھی ہوئی چیز" کے ہیں۔ پس "کتابا موقوتا" اس لئے کہا گیا کہ قلمِ الٰہی نے یہ لکھ دیا ہے کہ فلاں

نماز فلاں وقت پر ادا ہو جانا ضروری ہے اور "حجۃ و برہان" اس لئے کہ اکثر مذاکروں میں سند اور دلیل کے لئے دستاویزات اور سجلات اور کتابیں ہی پیش ہوتی ہیں۔ اور "کتابِ معلوم" اس لئے کہ ان کی ہلاکت کے لئے کاتبِ تقدیر نے معین وقت لکھ دیا ہے جو اٹل ہے۔

غرض اس مقام پر "کتاب" کے یہی بنیادی معنی مراد ہیں اور قرآنِ عزیز اسی مفہوم کے لحاظ سے "کتاب" ہے لیکن قرآن تو یہ کہتا ہے کہ میں "الکتاب" ہوں۔ عربی زبان میں "الف" "لام" تعریف کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ قرآن کو جو "الکتاب" یعنی بلام تعریف بتایا گیا ہے تو اس کی وجہ کیا ہے؟

ادیان و ملل کی تاریخ شاہد ہے کہ حضرت آدمؑ سے اب تک ہمیشہ سنۃ اللہ یہ جاری رہی ہے کہ ہر ایک امت کے لئے اس کے پیغمبر و رسول کے ذریعہ خدا کی کتاب، دستورِ حیات بن کر نازل ہوتی رہی ہے مگر جبکہ دنیا کے براعظموں اور ملکوں کے درمیان اجنبیت اور رسل و رسائل کی ہم آہنگی کے فقدان، نیز امتوں اور قوموں کی علمی اور عقلی نشوونما کی ابتدائی حالت کے پیشِ نظر مقتضیاتِ احوال کا فطری تقاضا یہ تھا کہ پیغمبروں اور رسولوں کی دعوت و ارشاد محدود علاقوں کے لئے مخصوص رہے اور ہر ایک قوم اور ہر ایک امت کے لئے ان ہی میں ہادی برحق مبعوث ہو کر خدا کا دستور پیش کرے تو خدائے کائنات کی ہمہ گیر قدرت کا یہ تقاضا بھی فطری اور نیچرل تھا کہ روحانی ارتقار کی یہ منازل ایک ایسے بامِ عروج پر پہنچیں کہ وہ وقت بھی آجائے جبکہ خدائی کتاب اور الہامی قانون تمام عالم زیر و بالا کے لئے ایک اور صرف ایک ہو اور جبکہ اس سے قریبی مابعد زمانہ میں مادی ارتقار اس حد تک پہنچ جائے کہ اس ساری کائنات کا ڈانڈے سے ڈانڈا مل جائے اور یہ تمام عالم بو قلمونِ خدا کا ایک کنبہ نظر آنے لگے یعنی مشرقِ بعید سے مغربِ بعید تک اور شمالِ منتہیٰ سے جنوبِ منتہیٰ تک دنیا کا ہر ایک گوشہ دوسرے سے متعارف ہو کر اس طرح ایک سلک میں منسلک ہو جائے کہ ہر گوشہ کی راحت و تکلیف دوسرے گوشہ پر اثر انداز ہو اور تمام کائنات کی بھلائی اور برائی کو ایک بنا دے تو ایسے مادی دور سے قریبی عرصہ میں ایسے روحانی پیغام

اور خدائی دستور و آئین کی کتاب کا نزول از بس ضروری ہے جو اسود و احمر، کالے اور گورے سب کے لئے یکساں ہو اور اس کے بنیادی اور اساسی قوانین یورپ و ایشیا اور امریکہ و افریقہ غرض کل کائنات پست و بالا کے لئے ہمہ گیر اور عالمگیر ہوں اور یہ دعوت پیغام بعثتِ عام بن کر اخوتِ کا پیغامبر ثابت ہو۔

فطرت اور قانونِ قدرت کے ارتقائی پہلو کا یہی وہ راز تھا جس کو آشکارا کرنے کے لئے ہر قوم اور ہر ملت میں مبعوث پیغمبروں اور نبیوں نے اپنا فرض انجام دیا اور پیغامِ ہدایت کے ساتھ ساتھ یہ بشارت بھی سنائی کہ وقت آئے گا جب ملکوں اور قوموں کے یہ مختلف پیغامات جو ایک ہی سرچشمۂ ہدایت کا پرتو اور عکس ہیں ایک اور صرف ایک عالمگیر پیغام میں جذب ہو کر رہ جائیں گے اور تمام الہامی کتابوں پر وہ جہاں گیر دستورِ آسمانی خطِ نسخ پھیر دے گا۔

چنانچہ توراۃ، زبور، انجیل، اوستا اور اپنشدوں کی الہامی و غیر الہامی بشارتیں مسلسل ایک ایسے نبی اور پیغمبر کی بعثت کا ذکر کرتی چلی آتی ہیں جو خدا کے آخری پیغام اور جامع کتاب کے ذریعہ کائناتِ ہست و بود کو ہدایت مآب اور فیضیاب کرے گا۔

توراۃ کتاب استثنا باب ۱۸ آیت ۱۵-۲۱ و باب ۳۱ آیت ۱۸-۲۱ و باب ۳۳ آیت ۲۔ اور انجیل متی باب ۲۰ آیت ۱-۱۶ و یوحنا باب ۱۶ آیت ۱۹-۲۲ اور باب ۱۶ آیت ۱-۸ اور زبور ۱۹ و ۹۶ اس کے لئے شاہد ہیں۔ اور انجیل برناباکی بشارات تو کثیر اور بہت صاف اور واضح ہیں۔

پس جب قرآنِ عزیز یہ کہتا ہے کہ وہ "الکتاب" ہے تو گویا وہ ملل و ادیانِ سماوی کو دعوت دیتا ہے کہ آؤ مجھ کو کسوٹی پر پرکھو اور میری تعلیم کا جائزہ لو تاکہ تم کو یقین کی روشنی ہاتھ آئے اور تم بآسانی اقرار کر سکو کہ بیشک یہ کتاب وہی جانی پہچانی کتاب ہے جس کے خدا کے آخری پیغام ہونے سے متعلق ہم اپنی سچی تعلیمات الٰہی میں تذکرے اور بشارتیں پاتے ہیں اور یہی وہ دستورِ کامل ہے جس کے چرچے ہم اپنی بہامی کتابوں کی معرفت خدا کے سچے پیغمبروں اور نبیوں سے سنتے آئے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ — وہ لوگ جو پیروی کرتے ہیں اس رسول کی

الاُمی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل یأمرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلل التی کانت علیھم (الاعراف)

جو نبی امی ہے کہ جس کو پاتے ہیں لکھا ہوا اپنے پاس توراۃ اور انجیل میں وہ حکم کرتا ہے ان کو نیک کام کا اور منع کرتا ہے بُرے کام سے اور حلال کرتا ہے ان کے لئے سب پاک چیزیں اور اتارتا ہے ان پر سے ان کے بوجھ اور وہ قیدیں جو اُن پر تھیں۔

چنانچہ توراۃ باب استثناء میں ہے۔

میں ان کے لئے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔

اسی کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے۔

وما ینطق عن الھوی ہ ان ھو الا وحیٌ یوحی۔ وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں بولتا یہ (قرآن) نہیں ہے مگر خدا کی وحی جو اس پر کی گئی ہے۔

اور انجیل یوحنا میں ہے۔

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ "مددگار" تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمہارے پاس بھیجدوں گا اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راست بازی سے اور عدالت کے بارہ میں قصوروار ٹھہرائے گا۔

غرض قرآنِ حکیم نے کائناتِ ملل وادیان کے سامنے "الکتاب" کہکر یہ واضح کرنا چاہا ہے کہ وہ خدا کی اس وحی کو اجنبی اور ان ہوئی بات نہ سمجھیں اور اس لئے اس معیار کے مطابق جو کتبِ سماوی کی معرفت کے لئے وجدان اور فطرت کی راہنمائی میں ہر ایک ذی عقل کو حاصل ہے اس کا امتحان کریں اور جانچیں کہ کائناتِ انسانی کی رشد و ہدایت کے لئے یہ "کتاب الٰہی" ہے یا کسی انسانی فکر و کاوش کی خود ساختہ "کتاب" اور جو صفات کہ ان کی الہامی اور آسمانی کتابوں میں خاتم الانبیاء اور

ان پر نازل ہونے والی کتاب سے متعلق بیان کئے گئے ہیں ان کی روشنی میں اس کا یہ دعویٰ کہ وہ "الکتاب" ہے کہاں تک درست اور حق ہے۔

قرآن عزیز نے اپنے اس وصف "کتاب و الکتاب" کا بہت سے مقامات پر بار بار ذکر کیا ہے اور استدلال و بیان کے مختلف طریقوں سے اس وصفِ خاص کو اس حد تک دہرایا ہے کہ وعظ و تذکیر کی جانب ادنیٰ توجہ کرنے والا انسان ہرگز متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قرآنِ حکیم کی ان آیات کو پیشِ نظر لانے کے لئے جن میں اس کو "الکتاب" یا "کتاب" کہا ہے حسب ذیل فہرست لائق توجہ ہے

بقرہ[۱] ۹/۷۹ ۔ ۱۵/۱۳۰، ۱۸/۱۵۳، ۲۱/۱۰۷ آل عمران ۱/۴، ۱/۸، ۳/۲۴، ۵/۴۹، ۶/۵۰، ۹/۸۲، ۱۹/۱۸۵، نساء
۱۶/۱۰۶، ۱۷/۱۱۱، ۲۰/۱۲۷ انعام ۱۱/۹۳، ۱۴/۱۱۵، ۲۰/۱۶۴ اعراف ۱/۳، ۶/۵۲، ۲۱/۱۷۱، ۳۳/۱۹۷ مائدہ ۱۵/۱۱۱، ۱۷/۴۹،
ہود ۱/۲، انفال ۱۰/۷۶ ابراھیم ۱/۲ یونس ۷/۶۲ نحل ۹/۶۵، ۶/۷۶، ۱۳/۹۰ ص ۳/۳۰ حم ۱/۱ احقاف
۱/۱، ۲/۱۳، ۴/۳۱ انبیاء ۲/۱۱، احزاب ۱/۷ سبا ۱/۴ کھف ۱/۲، ۴/۶۸ ۔ عنکبوت ۵/۴۸، ۵/۴۹، ۵/۵۲ شوریٰ
۲/۱۶، ۵/۵۲ قصص ۹/۸۷، زمر ۱/۲، ۴/۴۲ فاطر ۳/۳۰، ۴/۳۲ سجدہ ۱/۲ مومن ۱/۱، ۸/۷۲ رعد ۔ ۱/۱
دخان ۱/۱ الحجر ۱/۱

پھر قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے دستوری اور جانی پہچانی "الکتاب" ہی نہیں ہوں بلکہ نظام کائنات کے آئین و دستور کی وہ مکمل کتاب ہوں جس کے اوصاف عالیہ "مبین" (روشن و واضح) "عزیز" (قادر و غالب) اور "حکیم" (حکمت والی) ہیں۔

وہ "کتابٌ مبین" روشن کتاب ہے۔ مائدہ ۳/۱۶ یوسف ۱/۱ نمل ۱/۱ شعراء و قصص ۱/۱ زخرف ۱/۱ اس لئے کہ اس کے معجزانہ نظم و معانی ایک "امی" کی معرفت عبرت و موعظت سے متعلق ماضی اور مستقبل کے صحیح واقعاتِ تاریخی اور ان سے حاصل شدہ بے نظیر نتائج کے لحاظ سے نیز ایک کامل و مکمل دستور و آئین کی حیثیت سے وہ روشن اور واضح کتاب ہے نیز وہ اپنے مطالب و مفاہیم کے پیش نظر صاف اور ظاہر ہے جس میں کسی قسم کے شبہ و اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے یا اس لئے کہ وہ ہدایت و رشد کی

---

[۱] اوپر رکوع اور نیچے آیت کی علامت ہے۔

ظاہر کرنے والی اور یہود، نصاریٰ اور مشرکین کے سوالات وشبہات کا واضح طور پر مدلل اور تسکین بخش جواب دینے والی ہے۔

غرض معارف، حکم ومصالح، حقائق ودقائق اور عبر وموعظت سے متعلق تاریخی قصص و واقعات کے لئے ایک روشن اور واضح کتاب ہے۔

اسی طرح وہ "کتابِ عزیز" نادر و بے نظیر" وغالب ہے حٰم ۵ ۴۲ اس لئے کہ وہ اپنی مجموعی حیثیت میں ایک عدیم النظیر کتاب ہے جس کا جواب نہ ماضی دیسکا اور نہ مستقبل دے سکتا ہے اور جس کے معارضہ سے تمام کائنات انس وجن عاجز ہیں۔" قُل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یأتوا بمثل ھذا القرآن لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔" فأتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صٰدقین۔" نیز وہ ناسخ ہے تمام سابقہ کتب سماوی کیلئے اور اس لئے سب پر حاوی اور غالب ہے" لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکین" اور یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مکرم ومعظم ہے کہ اللہ کی عظمت وکرامت اس کے کلام کی کرامت وعظمت کا کفیل ہے۔

اور بلا شبہ وہ "کتابِ حکیم"[1] ہے۔ یونس ۱ لقمان ۱ اس لئے کہ اس کی آیات بینات اوامر ونواہی یعنی احکام الٰہی کی خالی ہیں اور اس طرح وہ ایسی کتاب ہے جو احکام کا معدن ہے نیز جس طرح ایک حکیم ودانا جب بولتا ہے حکمت ودانائی سے لبریز کلام کرتا ہے، اسی طرح یہ کتاب حکمتوں کا سرچشمہ اور دانائیوں کا مخزن ہے اور وہ جو کچھ دیتی ہے وہ حکمت ودانائی کے جوہر وگوہر ہی ہوتے ہیں اور یہ کہ وہ کائناتِ بحر وبر اور بلند وپست کے خالق ومالک" حکیم ودانا کی جانب سے ہے اس لئے جو کچھ اس میں ہے وہ حکمت ہی حکمت ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ قرآن ان صفاتِ علیا سے کیوں متصف ہے اس لئے کہ جبکہ مادی دنیا میں قانونِ قدرت کی رفتار کچھ اس طرح سے نظر آتی ہے کہ اولادِ آدم کا نشو ونما

---

[1] حکیم۔ حکم اور حکمت دونوں سے ماخوذ ہے۔

تدریجی ارتقاء کا رہینِ منت ہے یعنی اس کے فہم و عقل کی تکمیل آہستہ آہستہ ہوتی رہی ہے اور ذہنی اور عقلی کمالات اگرچہ مختلف زمانوں میں مختلف قوموں کے درمیان جدا جدا نظر آتے ہیں اور تاہم اہلِ عقل و نقل اس پر متفق ہیں کہ مجموعی حیثیت سے حضرت انسان کے عقلی و ذہنی افکار نے تدریجی ترقی کی ہے اور بلاشبہ موجودہ دور جو چند صدی کا دور ہے ارتقائی کمالات کا حامل ہے۔

پس اگر یہ صحیح ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ یہی قانونِ قدرت روحانی کائنات پر بھی حاوی ہے اور اسی کے پیشِ نظر قدیم کتبِ سماوی میں توحید، صفاتِ الٰہی اور الٰہیات کے نازک مسائل کو قریب الفہم بنانے کے لئے ایسی تشبیہات کو جائز رکھا گیا جو بن دیکھے خدا اور بن دیکھی دنیا (آخرت) پر ایمان لانے میں آسانی اور سہولت پیدا کر دیں اور جب آہستہ آہستہ الٰہیات کے نازک مسائل کو عقل و فہم انسان نے اپنے اندر جذب کرنا شروع کر دیا اور اس کی عمیق پہنائیوں تک رسائی کے لئے کاوش و جستجو سر اٹھانے لگی تو دعوت و ارشادِ خداوندی نے بھی اس کو سہارا دیا اور اپنے پیغامات کے اندر اسلوبِ بیان میں ارتقائی منازل کا خاص خیال رکھا چنانچہ عہدِ قدیم کی کتبِ سماویہ باوجود تحریف و تنسیخ کے اپنے مختلف ادوارِ تاریخی کے پیشِ نظر مختلف اسلوب و طرزِ بیان کو پیش کرتی اور مسطورہ بالا دعوی کے لئے شہادتِ صادق کی حیثیت رکھتی ہیں چنانچہ دنیائے مذہب کی ابتدائی تعلیم میں تشبیہی تعبیرات اور مسائل الٰہیات کی تفہیم میں استعارات و کنایات اور دورِ متوسط میں حنیفیت اور شرک کے متمائز تقابل کے باوجود صفاتِ الٰہیہ کی تلقین و تعلیم میں تشبیہی رنگ و روغن اور تبلیغی نظام میں ملکوں اور قوموں کے مختلف احوال و مقتضیات کے پیشِ نظر جدا جدا پیغامات اور مختلف اسلوب خطابیات یہ سب امور اس حقیقت کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ اور اگرچہ یہ مسلم ہے کہ انسانی قوائے فکریہ و عقلیہ خدائے تعالیٰ کے فیضان کی بدولت مسلسل ترقی پذیر ہیں اور اس کی حدِ نظر ہماری ان نگاہوں سے مستور "لا تقف عند حد" کا نظارہ پیش کرتی ہیں۔ تاہم اہلِ دانش کے نزدیک یہ ہے کہ قریبی دور میں جس کا خط اس دور تک طویل ہے بنیادی طور پر انسانی عقل و فکر اتنی پختگی کی حد پر پہنچ چکی ہے اور بلوغت و رشد کی حدود کے لحاظ سے معراجِ کمال حاصل کر چکی ہے اس لئے از بس

ضروری ہے کہ اس مادی عروجِ ذہنی وفکری کے دور میں خدا کا روحانی پیغام بھی اسی صفتِ کمال کا حامل ہو اور اس کی تعلیم بھی تاریخ ملل وادیان کے مختلف ادوار کے مقابلہ میں بلوغت ورشد کی آخری حد تک رسا ہو۔

پس قرآن کہتا ہے کہ اس ناموس فطرت اور قانونِ قدرت یعنی "سنۃ اللہ" کے پیشِ نظر "میں" خدا کا ایسا قانونِ کامل ہوں جو اپنی تعلیمات "الٰہیات، اخلاقیات، مدنیات، معاشیات و معادیات" کے ہر پہلو میں روشن اور واضح اور تشبیہ وتجسیم کی تعبیرات سے پاک ہے۔ نیز جغرافی، لسانی ملکی اور قومی حدود سے بالاتر، حکمتِ بالغہ پر حاوی اور نظم ومعانی کے انسجام اور آئین وقوانین کے بنیادی انصرام میں حد اعجاز کا حامل ہے اور اس لئے بلاشبہ میں اس کائناتِ ہست وبود میں خدا کی عدیم النظیر، درخشاں اور پُراز حکمت "کتابِ مبین" "کتابِ عزیز" "کتابِ حکیم" ہوں۔

پھر یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ اس مادی دنیا میں کسی تک پیغام پہنچانے کے دو ہی طریقے ہیں ایک یہ کہ جس بات کو کہنا ہے اس کو حرف بہ حرف خود ادا کرتا اور یا بذریعہ تحریر وتقریر قاصد کی معرفت بحالہ پہنچا دینا اور دوسرا یہ کہ اپنا مفہوم اور نفسِ مضمون بیان کر دینا اور پیغامبر کو یہ حق دینا کہ وہ اس مفہوم کو بذریعہ تحریر یا زبانی اپنی عبارت میں مخاطب کو پہنچا دے۔ جب مخاطب تک یہ پیغام پہنچے گا اور اس کو پیغام کی نوعیت کا بھی علم ہو جائے گا تو ضروری ہے کہ دونوں قسم کے پیغامات کا اثر مخاطب پر مختلف ہو کیونکہ پہلا پیغام نہ صرف پیغام کا ہی حق ادا کرتا ہے بلکہ ساتھ ساتھ پیغام دینے والی ہستی کے کلام کی تمام خصوصیات اور اس کے امتیازات بھی پیشِ نظر لاتا ہے اور اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مخاطب کے قلب ودماغ پر عظمت ومحبت کا جذبہ بہت زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے اور دوسرے طریق میں وہ صرف پیغام ہی حاصل کرتا ہے متکلم کے کلام کے خصائص وامتیازات سے بہرہ ور نہیں ہوتا اور پیغام اگرچہ مقصد کو پورا کر دیتا ہے لیکن اُس قسم کے جذبات نہیں پیدا کر سکتا۔

پس قرآن ان صفات کے پردہ میں اس حقیقت کو بھی نمایاں کرنا چاہتا ہے کہ ابنِ آدم نے جس وقت سے صفحۂ دنیا کو اپنی ہستی کے نقش ونگار سے مزین کیا ہے اس وقت سے قرآن کے

نزول تک تمام روحانی پیغامات جو الہامی کتابوں کی شکل میں خدا کی جانب سے نازل ہوئے وہ خدا کے احکام کا ایسا مجموعہ تھے جن کو خدا کی کتاب خدا کا قانون، خدائی فرمان اور پیغام الٰہی تو کہا جائیگا لیکن "کلام الٰہی" نہیں کہا جاسکتا کیونکہ پیغامبر (ناموس اکبر یا جبرئیل) نے ہر ایک نبی و رسول کو یا الواح کی شکل میں مسطور یا مفہوم ربانی کو اپنی تعبیر وحی کی شکل میں منقول پیش کیا ہے اور بفحوائے ارشادِ قرآنی "وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ" "وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ" توراۃ، زبور، انجیل، صحفِ ابراہیم (علیہ السلام) اور کائنات کے دوسرے انبیاء و رسل کے صحیفے سب کے سب "کتاب اللہ" تو ہیں لیکن "کلام اللہ" نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جن قوموں پر ان کتابوں کا نزول ہوا ان کو یہ بھی ہدایت کی گئی کہ وہ ان پر مضبوطی سے قائم رہیں اور ان کی حفاظت کریں اور اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا اور ان میں تحریف و تبدیل کا مجرمانہ اقدام شروع کر دیا تو یاد رکھیں کہ پھر ان کی تباہی اور بربادی قریب ہے۔ چنانچہ توراۃ، زبور اور انجیل میں اس قسم کے تہدیدی احکام امثال کی شکل میں بھی بکثرت موجود ہیں اور صاف صاف الفاظ میں بھی پائے جاتے ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ ان کتابوں سے وابستہ اہل مذاہب خود اس کے معترف ہیں کہ ان کے زوال کا باعث وہ تحریف ہے جو انھوں نے (ان کے پیشروؤں نے) خدا کی جانب سے نازل شدہ کتابوں میں کی اور آج وہی محرف کتابیں ہمارے سامنے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ میں خدا کی وہ کتاب ہوں جو نہ صرف کتاب ہے بلکہ "کلام اللہ" بھی ہوں اور اس لئے دوسری آسمانی کتابوں سے جدا میری یہ خصوصیت ہے کہ جس طرح خدا ہر قسم کے تغیر و تبدل سے پاک اور منزہ ہے اسی طرح متکلم کی خصوصیت و امتیازی شان اس کے کلام میں بھی موجود ہے کہ وہ بھی تحریف و تبدیل سے محفوظ و مامون ہے "لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید" اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا بار دوسری کتابوں کی طرح امت اور رسول پر نہیں رکھا بلکہ اپنی جانب سے اس کی حفاظت و صیانت کا اعلان فرمایا اور اس کی ذمہ داری اپنی ذاتِ بحت پر ہی رکھی "نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" "لا تحرک بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ وقرآنہ فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ

ثم ان علینا بیانہ"

غرض قانونِ قدرت کی ہمہ گیر وحدت یہ فیصلہ دینے میں حق بجانب ہے کہ قرآن کا یہ دعویٰ "عینِ فطرت" ہے کہ وہ کائناتِ ادیان وملل میں خدا کی سچی "کتاب" ہے اور اپنے نزول سے قبل سماوی کتابوں اور خدا کے سچے رسولوں اور نبیوں کی معرفت وہ اس طرح متعارف اور معروف ومشہور ہو چکی تھی کہ نزول کے وقت اس کا یہ دعویٰ بلاشبہ درست اور صحیح ہے کہ وہ جانی پہچانی "الکتاب" ہے۔ اور اس کی سادہ اور صاف، روشن اور درخشاں تعلیم اس کا حق رکھتی ہے کہ اس کو یہ کہا جائے کہ وہ "کتاب مبین" ہے اور چونکہ وہ خدا کی صفتِ کلام سے متصف ہو کر "کلام اللہ" ہونے کا بھی شرف رکھتی ہے اس لئے یقیناً وہ الہامی کتابوں میں ایک بے نظیر اور نادر کتاب ہے اور جبکہ قدیم ازلی وابدی ذاتِ احدیت کے صفتِ کلام ہونے کی وجہ سے موصوف کی طرح غیر متبدل وغیر متحرف بھی ہے اور تاقیام قیامت اسی طرح رہے گی تو بلاریب اس کا یہ قول حق ہے کہ وہ "کتابٌ عزیز" ہے اور جبکہ وہ بفحوائے آیت "تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ" ایسے حکیم ودانا کا کلام ہے جو تمام حکمتوں اور دانائیوں کا منبع ومرجع ہے تو پھر اس کا یہ اعلان بے داغ آئینہ صداقت ہے کہ وہ "کتاب حکیم" ہے۔

یہی وجہ ہے کہ زبان وحی ترجمان (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کتاب کی تعلیم کے متعلق یہ پُر از حکمت جملہ ارشاد فرمایا "الدین السمحۃ البیضاء لیلھا ونھارھا سواء"[1] قرآن کا بتلایا ہوا دین آسان وروشن دین ہے جس کے رات دن دونوں یکساں ہیں"

یعنی اس کتاب کے آئین وقوانین اس قدر صاف اور سادہ ہیں کہ جن پر گامزن ہونے کے لئے دوسرے مروجہ ادیان کی طرح نہ سخت قیود ہیں اور نہ کڑی پابندیاں اور اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ اس کی بنیادی تعلیمات میں سابقہ ادیان کی طرح نہ تشبیہ وتجسیم کے خلل کا اندیشہ ہے اور نہ اس کے معتقدات میں استعارات وکنایات کی پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں اور اس کے اوامر ونواہی اس کی

---

[1] وعید ونہی، ترہیب مثل شب کی ہیں اور وعد وامر، ترغیب دن کی طرح ہیں مگر حدیث کہتی ہے کہ اس تعلیم حق کی رات بھی ظلمت وتاریکی سے محفوظ روز روشن کی ہی طرح روشن ہے۔

ترغیبات وترہیبات احداس کے وعد و وعید جو کہ ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ اور لیل و نہار کی طرح توام ہیں تاریکی اور ظلمت سے یکسر پاک اور بے لوث ہیں اور دونوں اصنافِ تعلیم آفتاب نصف النہار کی طرح روشن اور درخشاں ہیں۔

آئیے اب ایک مرتبہ پھر اس آیت کی جانب رجوع کریں جو قرآن کی سورۂ بقرہ میں پہلی آیت ہے اور جس نے کائنات کو یہ روشناس کرایا ہے کہ ہم یہ جو کچھ دیکھ رہے یا پڑھ رہے ہیں کائناتِ انسانی کی معاش و معاد کی تکمیل کے لئے خدا کی جانب سے کامل و مکمل کتاب ہے۔

"الٓمٓ" یہ تین حروف کا مجموعہ ہے جو جدا جدا حرف ہی کی طرح پڑھنے میں آتے ہیں اور اسی لئے قرآن کی سورتوں میں ایسے تمام حروف "حروفِ مقطعات" کہلاتے ہیں، ان حروف کے متعلق اکثر سلف صالحین صرف یہ کہنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں "اللہ اعلم بمرادہ بذالک" اس کی کیا مراد ہے خدا ہی خوب جانتا ہے؟ اور اپنے اس قول کی دلیل میں یہ فرماتے ہیں کہ جبکہ یہ حروف باہم مل کر بھی چھوٹے سے چھوٹے لفظ دو حرفی کی شکل اختیار کئے ہوئے نہیں ہیں اور جدا جدا پڑھے جاتے ہیں تو ان کی مراد نہ جاننے سے قرآن کی تعلیم پر مطلق کوئی اثر نہیں پڑتا اور ان کی حقیقت جانے بغیر کسی ایک آیت کے مفہوم و معنی یا چھوٹے سے چھوٹے جملے کی مراد سمجھنے میں کسی قسم کی بھی دقت پیش نہیں آتی تو پھر کیا ضرورہے کہ ہم ان حروفِ مفردہ کی حقیقت معلوم کرنے کے درپے ہوں اور کیوں نہ اس کو خدا کے حوالہ کردیں۔

یہ طریقہ اگرچہ نفس صورت حال کے پیشِ نظر سلامت روی پر مبنی ہے۔ تاہم تبلیغی نقطۂ نظر سے ان مسلم و غیر مسلم افراد کی افہام و تفہیم کے لئے جو قدم قدم پر شکوک و شبہات کی وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں ان مفرد حروف کی حقیقت کی نقاب کشائی بھی ازبس ضروری ہے تاکہ نفسِ امارہ کا پرخطر اقدام اس الحاد کی جانب متوجہ نہ کرسکے کہ قرآن جبکہ موعظت و بصیرت کے لئے ہادی اور راہنما ہے تو اس کا ایک حرف بھی ایسا کیوں ہے جس کی مفہوم و مراد سے ذی عقل و ذی فہم انسان ناواقف رہے اور وہ ایسا راز کیوں ہے جس کی مفتاح اور کلید کو خدائے برتر نے اپنے پاس محفوظ کرلیا ہے خصوصاً جبکہ قرآن کے

متعلق اُس نے یہ فرمادیا ہے "ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر"

اس لئے صحابہ (رضی اللہ عنہم) تابعین (رحمہم اللہ) اور علماء سلف کی ایک جماعت سے ان کے متعلق متعدد توجیہات بھی روایت کی جاتی رہی ہیں ان توجیہات میں بنیادی فرق یہ ہے کہ بعض وہ توجیہات ہیں جو جدا جدا سورتوں کے حروفِ مقطعات کی توجیہ کرتی ہیں اور سب کے لئے یکساں حکم نہیں لگاتیں اور بعض توجیہات وہ ہیں جو تمام سور کے حروف مقطعات پر یکساں حاوی ہوتی ہیں اس لئے مقام کی مناسبت کے پیشِ نظر ہم ان ہر دو قسم کی توجیہات میں سے ایک ایک توجیہ نقل کر دینے پر اکتفا کرتے ہیں۔

حروف مقطعات دراصل قرآن کی متعلقہ سورتوں کے نام ہیں یعنی جس طرح دوسری سورت کا نام بقرہ ہے اسی طرح اس کا نام سورۂ الٓمٓ بھی ہے اور اُن ہی سورتوں کو حروفِ مقطعات کے نام سے نامزد کیا گیا ہے جن میں اعتقادی، اخلاقی قانونی یا دوسرے معاشی و معادی مہم مسائل کا ذخیرہ بکثرت یکجا جمع ہے اور جن کے بنیادی اصول پکار پکار کر یہ بتلا رہے ہیں کہ کائناتِ مادی اور ذہنی و فکری ترقی کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی بامِ عروج پر پہنچ جائے لیکن یہ اصولِ اعتقاد اور اساسِ اخلاق اور قوانینِ معاش و معاد ایسے اٹل ہیں کہ تعصب سے دور کوئی شخص بھی ان کو جانچے یا پرکھے گا تو اس کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہ اساسی قوانین جس طرح نزولِ قرآن کے وقت کی دنیا کے لئے موزوں اور مناسب تھے اسی طرح آج بھی بے میل اور بغیر ترمیم رشد و ہدایت انسانی کے لئے کافی و وافی ہیں تو خدائے برتر کی حکمتِ بالغہ نے ان سورتوں کے شروع میں اس لئے حروفِ مقطعات کو پیش کیا اور اس لئے اِن سورتوں کا عنوان بنایا کہ اہلِ عقل و خرد کے سامنے اس حقیقت کا اعلان کیا جائے کہ تم یہ جو کچھ دیکھ رہے یا پڑھ رہے ہو یا سن رہے اور سنا رہے ہو۔ اس کو غور و فکر سے دیکھو اور نظر و فکر کی کسوٹی پر کس کر دیکھو کہ یہ بنیادی اور اساسی قوانین کس طرح مبنی بر اعجاز حقیقت سے وابستہ ہیں کہ دانا اور حکیم و فرزانہ ہستی جس قدر عمیق نظر سے ان کو جانچتی ہے اسی قدر ان کی ٹھوس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اور یہ دیکھ کر حیرت میں رہ جاتی ہے کہ قرآن کے اوامر و نواہی اور اس کے

مواعظ و بصائر جس طرح ایک عامی اور ان پڑھ کے لئے باعث رشد و ہدایت ہیں اسی طرح ایک بڑے سے بڑے حکیم اور فیلسوف کے لئے بھی ہادی و مرشد ہیں اور جس طرح وہ اپنے وقتِ نزول میں بے نظیر و بے مثال تھے اسی طرح آج کے دورِ ترقی میں بھی عدیم المثال اور عدیم النظیر ہیں۔

اور یہ حیرت و استعجاب اس وقت عجیب صورت اختیار کر لیتا ہے جبکہ ایک حقیقت نگاہ اور دقیقہ سنج فلسفی و حکیم کو قرآنی حروفِ مقطعات کے ذریعہ اس جانب متوجہ کرتا ہے کہ یہ پُر از حکمت اور اٹل قوانین و دساتیر کہ جن کی مثال پیش کرنے سے انسانی دماغ و عقل عاجز ہیں اور یہ کتاب جس کے کلامِ الٰہی ہونے کی وجہ سے کسی انسان کو اس کے معارضہ کی جرأت نہیں ہو سکی اور نہیں ہو سکتی وہ ان ہی حروفِ تہجی کا مجموعہ ہے جس کو ایک بہتر سے بہتر مقرر اور انشا پرداز روز و شب اپنی تقریر و تحریر میں استعمال کرتا رہتا ہے تو پھر کائناتِ انسانی میں سے کسی کا قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ کی طرح کا کوئی مضمون پیش کرنے سے اُس وقت عاجز رہنا اور قرآن کی تحدی کے باوجود عاجز رہنا جبکہ عرب کی سرزمین عربی فصاحت و بلاغت کے اساتذۂ فن کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھی اور پھر رہتی دنیا تک مسلسل اس کے چیلنج "فأتوا بسورة من مثله" کا جواب نہ پیش کر سکنا کیا اس حقیقت کے لئے روشن دلیل نہیں ہے کہ یہ کتاب بلاشبہ خدا کی جانب سے ہے اور یہ کلام درحقیقت کلامِ الٰہی ہے نہ کہ کلامِ انسانی۔ وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا ۲ بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔

اس حقیقت کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ انسانی بول چال میں چونکہ الفاظ عموماً مفرد حرف سے لے کر پنج حرفی تک رہتے ہیں اس لئے قرآن نے بھی جب اپنے اعجاز کو حروفِ مقطعات کے ذریعہ ظاہر کرنا چاہا تو بول چال میں الفاظ کی ان تراکیب کا لحاظ کرتے ہوئے مقطعات کو بھی ایک حرف سے پانچ حروف تک کی ترکیب میں پیش کیا ہے۔ مثلاً نٓ، قٓ، حٰمٓ، الٓمٓ، الٓرٰ، کٓھٰیٰعٓصٓ، حمٓعسٓقٓ قرآن نے ان کو ایک جگہ اس لئے پیش نہیں کیا کہ جس طرح وہ عبرت و موعظت کے لئے واقعات کو بار بار مختلف اسلوب سے دوہراتا ہے اسی طرح وہ اس حقیقت کو بھی بار بار دہرانا مفید سمجھتا ہے

پس جب تم اس حقیقت کے اعتراف کے لئے سرِ تسلیم خم کرکے اس کتاب کا مطالعہ کروگے تو بلاشبہ تمہارے سامنے اس کے حقائق و معارف کا باب کھل جائے گا اور پھر تم کو یہ اقرار کرنا پڑے گا کہ "لا تقضیٰ عجائبہ" یہ وہ کتاب ہے جس کے عجائب و لطائف ختم ہی ہونے میں نہیں آتے۔"

کہا جا سکتا ہے کہ یہ تسلیم کر لینے کے باوجود کہ عہد قدیم و عہد جدید برابر قرآن کے اس چیلنج کے حقیقی اور صحیح جواب سے عاجز رہے اور اس کے قبول میں کسی کو بھی کامیابی نصیب نہیں ہوئی اور اسی لئے اہلِ نظر نے ہمیشہ ہی اس تحدی (چیلنج) کے قبول کرنے سے گریز پائی کا ثبوت فراہم کیا ہے تاہم اس سے کسی کتاب کا "کتاب اللہ" ہونا کیسے لازم آتا ہے، ہو سکتا ہے کہ ایک ایسی کتاب جس کا جواب نہ اگلوں سے ہو سکا اور نہ پچھلوں سے اپنی تدوین و ترتیب میں کسی انسان ہی کے قلم کی رہینِ منت ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے اپنے اعجاز اور کلام الٰہی ہونے کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کا مدار صرف اتنی سی بات پر ہی نہیں ہے کہ وہ ایک کتاب ہے جس کے ایک پیراگراف یا چھوٹی سی سورت کا جواب دنیا میں موجود نہیں ہے بلکہ اس کے دعوی کا مدار تو اس اعلان پر ہے کہ میں خدا کی جانب سے ہوں اور اس کا کلام ہوں اور میری ترتیب و انسجام میں خود محمد رسول اللہ کو بھی دخل نہیں ہے بلکہ وہ بھی اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز ہیں لہذا جو شخص یہ تسلیم نہ کرے اور وہ اس کو انسان کا درجہ دیتا ہو تو اس کا فرض ہے کہ وہ خود اور پوری کائنات کے انس و جن کو جمع کرکے ایسی کتاب نہیں بلکہ اس جیسی ایک چھوٹی سی سورۃ یا چھوٹا سا پیراگراف پیش کر دے تاکہ قرآن کا چیلنج غلط ثابت ہو اور وہ کلامِ الٰہی کے دائرہ سے نکل جائے اور انسانی کلام کے حدود میں آجائے پس اگر کوئی کتاب اپنے خدا عجاز کے پیشِ نظر کائناتِ انسانی کو تحدی سے دوچار کرے اور پھر عقلاءِ زمانہ کو اس کتاب کی عظمت و فخامت اور اس کی تعلیم کی بلندی و رفعت کا بھی اعتراف ہو تو ایسی صورت میں دو ہی راہیں ہو سکتی ہیں کہ یا فصحاء و بلغاءِ زمانہ اس چیلنج کی عملاً تکذیب کر دکھائیں اور یا پھر اس کے چیلنج کو صحیح تسلیم کرکے اس کے کلامِ الٰہی ہونے کا اعتراف کریں۔

غرض معاملہ صرف خوبیِ کلام کا نہیں ہے بلکہ اس خوبی کو عدیم النظیر بتا کر اور انسانی و بشری

طاقت سے خارج کہہ کر دعویٰ کی تصدیق یا تکذیب کے لئے چیلنج و تحدی کرنے کا ہے اور ایسا دعویٰ جب ہی جھٹلایا جا سکتا ہے کہ عملی طور پر اس کے خلاف ثبوت فراہم کر دیا جائے مگر یہاں تو صورتِ حال یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت جبکہ یہ دستور تھا کہ عرب کے بڑے بڑے فصیح و بلیغ مسلم اساتذہ، زبان کے کمالات کو نظم کی شکل میں پیش کرنے کے لئے کعبہ کی دیوار پر اپنے قصائد اس لئے لٹکا دیا کرتے تھے کہ استادِ وقت ان پر اصلاح دیتے ہوئے ان کی فصاحت و بلاغت کے مراتب کا بھی اظہار کرے اور ان پر برتری و تفوق کے نمبر لگائے تو اس دور میں جب سورۂ کوثر کا نزول ہوا اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو حکم دیا کہ اس کو لکھ کر کعبہ کی دیوار پر لٹکا دیں چنانچہ اس تعمیلِ حکم کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب استاذ الاساتذہ اور وقت کے ماہر زبان نے معلق قصائد کا مطالعہ اور ان کی حیثیت کو ظاہر کرنا شروع کیا اور آخر اس جگہ پہنچا اور سورۂ کوثر پر اس کی نظر پڑی تو تاریخ شاہد ہے کہ حیران و سرگرداں انسانوں کی طرح اس کو صرف یہی کہنا پڑا "واللہ ماھذا کلام البشر" قسم بخدا یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے"۔

پس اس تحدی اور چیلنج کی موجودگی میں کائناتِ جن و انس کی اس کے معارضہ سے عاجزی کا اعتراف یقیناً اس کے کلامِ الٰہی ہونے پر حجت و برہان ہے۔

"الٓمٓ" کی دوسری توجیہ جو درحقیقت پہلی توجیہ کا ہی ایک حصہ مگر خصوصیتِ مقام کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک تمہید کی محتاج ہے وہ یہ کہ "فطرت" راہنمائی کرتی ہے کہ جب ہمارے پاس کسی جانب سے کوئی مکتوب موصول ہوتا ہے تو طبیعت جستجو کرتی ہے کہ اس سلسلہ میں تین امور کا جاننا ضروری ہے ایک یہ کہ یہ مکتوب کس ہستی کی جانب سے موصول ہوا ہے تاکہ اگر باپ، استاذ یا دوسرے کسی مخدوم کی جانب سے ہے تو ان کے مرتبہ کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے۔ اور اگر اولاد یا کسی خورد کی جانب سے ہے تو اس کے پیشِ نظر سلوک ہو اور اگر دوست یا محبوب کی جانب سے ہے تو پھر اسی نظر سے اس کو دیکھا جائے اور یہی نہیں بلکہ یہ جان لینے کے بعد کہ یہ مکتوب کس کی جانب سے ہے طبیعت اسی کے مطابق خود بخود متاثر ہونے لگتی ہے اور عظمت،

شقفت یا محبت کے جذبات نفسیاتی طور پر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ دوسری بات یہ معلوم کرنے کے لائق ہوتی ہے کہ اس مکتوب کا لانے والا کون ہے یعنی قاصد کی اہمیت بھی قابلِ نظر انداز نہیں ہوتی اس لئے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ مکتوب حقیقتاً اس ہستی کی جانب سے نہیں ہوتا جس کی جانب وہ منسوب ہے بلکہ جعلی طور پر اس کو منسوب کرکے دھوکا دینے کی کوشش کی جاتی ہے اور کبھی محض تفریح اور حصولِ زر کی خاطر ہر وپیہ بن کر فریب کیا جاتا ہے۔ اور اگر اس مکتوب کا تعلق مکتوب الیہ کے علاوہ دوسرے اشخاص و افراد سے بھی ہوتا ہے تو پھر تیسری بات یہ بھی قابلِ توجہ ہوتی ہے کہ مکتوب الیہ کی شخصیت کس درجہ اہمیت رکھتی ہے اور صاحب مکتوب کے یہاں اس کا کیا درجہ ہے۔ تاکہ اس پیغام کی عظمت و جلال کا اندازہ ہو سکے جو صاحبِ کتاب نے مکتوب الیہ کے ذریعہ دیا ہے۔

یہ بات ایسی فطری اور نیچرل (Natural) ہے کہ معمولی فہم و عقل بھی ان امور سے متعلق تفتیش و جستجو ضروری سمجھتی ہے تاکہ مکتوب کے متعلق، صحیح فیصلہ تک پہنچنے میں آسانی ہو۔

پس قرآن بھی اس فطری نقطۂ نظر کی روشنی میں اپنے قاری اور مطالعہ کرنے والے کو یہ بتلا دینا ضروری سمجھتا ہے کہ یہ کتاب ایسی بالاتر ہستی کی جانب سے آئی ہے جس کو "اللہ" کہتے ہیں اور جو جمیع صفات کمال کا محور و معدن ہے لہٰذا مخاطب بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ اس ذات پاک کی جانب سے جو مکتوب (کتاب) رشد و ہدایت کے پیغام کے لئے آیا ہے اس کی عظمت و رفعت کا کیا حال ہوگا خصوصاً جبکہ وہ صرف کتاب ہی نہ ہو بلکہ "ربانی کلام" بھی ہو، اور یہ بھی واضح کرنا چاہتا ہے کہ یہ کتاب ایک ایسے ذی عزت قاصد کے ذریعہ بھیجی گئی ہے جو "جبرئیل" یا ناموس اکبر کہلاتا ہے۔ اور جو اس پاک جماعت کا مرد کامل ہے جس کو دینی اصطلاح میں فرشتہ کہا جاتا۔ اور عقل اور فلسفہ کی نگاہ میں "جوہر مجرد" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور صاحبِ مکتوب کی درگاہِ رفعت پناہ میں جن کی وفاداری اور فداکاری نیز جن کی عصمت و پاکی کا یہ عالم ہے کہ

لا یعصون اللہ ما امرھم و یفعلون ما یؤمرون۔ (فرشتے) اللہ کے احکام کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو ان کو حکم دیا جاتا ہے۔

اور عالم قدس سے عالم ارضی کی جانب پیغام پہنچانے کے لئے جس کی صلاحیتوں کا یہ حال ہے کہ "علمہ شدید القوی ذومرۃ" اس کو (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو) جتلایا ہے سخت قوتوں والے زور آور نے (جبرئیل نے) بس یہ ہے وہ ناموس اکبر "جبرئیل امین" جو اس پیغام کا پہنچانے والا ہے۔

پھر اس کتاب کا مکتوب الیہ وہ مقدس ہستی ہے جس کا نام "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے جن کی عظمت شان اور رفعت مکان کا یہ حال ہے کہ اس نے "امی" ہونے کے باوجود دنیا کے وحشی انسانوں کو "انسان کامل" بنا کر دنیا کا معلم و ہادی بنا کر پیش کر دیا، کیا تاریخ عالم نے اس دور کی جو مذہبی تاریخ پیش کی ہے وہ اس کی شاہد نہیں ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس تعلیم نے کس طرح تاریک دنیا کو روشن راہ دکھائی؟

یہی وہ ہستی ہے جس کی تقدیس و تکریم کی شہادتیں دنیا کے مذہب کے ہر کتاب اور ہر پیغمبر اور رشی و منی دیتے چلے آئے ہیں اور انبیاء بنی اسرائیل میں خصوصاً جس کے نزول کا اس درجہ اعتراف و انتظار رہا ہے کہ "یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم" یہ (یہود و نصاریٰ) محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو (یعنی ان کو نبوت و رسالت کو) اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح وہ اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں" "النبی الامی الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل"۔

پس اس کتاب (مکتوب) کے مطالعہ اور "ذالک الکتاب لاریب فیہ الآیۃ" پر ایمان و ایقان سے قبل اس کی جلالت قدر اور عظمت شان کی معرفت کے لئے یہ معلوم ہو جانا از بس ضروری ہے کہ یہ "اللہ" کی جانب سے آئی ہے "جبرئیل" اس کا قاصد و سفیر ہے اور "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب بھیجی گئی ہے گویا مختصر تعبیر کے ذریعہ تین حروف سے تین ہستیوں کی جانب اس حسن و خوبی سے اشارہ کر دیا گیا کہ ایک ہی پیرایۂ بیان میں اس عام حکمت کی جانب بھی رہنمائی ہو جائے جو تفصیل کے ساتھ پہلی توجیہ کی شکل میں بیان کی جا چکی ہے اور اس دوسری توجیہ کی جانب بھی توجہ مبذول ہو سکے جو ابھی زیر بحث آئی ہے یعنی آ سے "اللہ" ل سے "جبرئیل" اور م سے "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) مراد ہیں۔

حکمت مسطورہ بالا کے علاوہ ناموں کا حروف کے ذریعہ اظہار ایسی خبر نہیں ہے جو اہلِ علم و عقل کے نزدیک مستبعد اور تعجب خیز سمجھا جائے اس لئے کہ قدیم وجدید ہر ایک دور میں ناموں کے اختصار کے لئے حروف سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ عرب ہند اور مصر کے مخطوطات و کتبات میں خصوصیت کے ساتھ اس کی شہادتیں ملتی ہیں اور آج کے علمی دور میں تو یہ اختصار نہ صرف ضرورت کے لئے ہی استعمال ہوتا ہے بلکہ اس کے ذریعہ مسمّٰی شخصیت کی اہمیت کو دوبالا کیا جاتا اور عظمت و وقار کا ایک وسیلہ شمار ہوتا ہے چنانچہ آپ ل احمد میں جو ادبی شان مستور پاتے ہیں وہ لطیف الدین احمد سے ظاہر نہیں ہو سکتی۔

بہرحال اسماء و اعلام کو حروف کے ذریعہ اظہار کا طریقہ علمی و ادبی ہے اور صراحت سے زیادہ وقیع اور اہم سمجھا جاتا ہے۔

البتہ اس جگہ یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اعلام کے اظہار کے لئے پہلے حرف ا اور م کو اختیار کیا گیا اسی طرح جبرئیل کے اظہار کے لئے ج کو کیوں نہ لیا گیا اور آخر حرف کے لانے کی وجہ کیا ہے؟

تو اس سوال کو حل کرنے کے لئے پہلے اس حقیقت پر غور کرنا چاہئے کہ اگر کسی معاملہ میں چند شخصیتیں متعلق اور وابستہ نظر آتی ہوں تو یا تو اس معاملہ سے ان تمام شخصیتوں کا یکساں تعلق ہوتا ہے اور یا بعض ایسی ہستیاں بھی ہوتی ہیں جو صرف وسیلہ اور واسطہ کا کام تو دیتی ہیں لیکن اس معاملہ کا براہِ راست ان کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لہٰذا عقل یہ فیصلہ دینے پر مجبور ہے کہ پہلی صورت میں ان شخصیتوں کا تذکرہ ایسے اسلوب سے ہونا چاہئے کہ ان کے تعلق کی یکسانیت میں کوئی فرق نہ آنے پائے اور دوسری صورت میں براہِ راست متعلق اشخاص و افراد کا ذکر تو یکساں اسلوب پر ہونا چاہئے مگر وسیلہ اور واسطہ بننے والی ہستیوں کا تذکرہ دوسرے اسلوب سے ہونا ضروری ہے تاکہ دونوں قسم کے تعلق کا امتیاز باقی رہے۔

پس اگر عقل و خرد کا یہ فیصلہ صحیح ہے اور بلاشبہ صحیح ہے تو مقام زیرِ بحث میں پیدا شدہ

سوال کا جواب یہ ہے کہ "الکتاب" کا براہ راست دو ہی مقدس ہستیوں سے وابستہ ہے ایک "صاحب کتاب" جو آمر و ناہی اور موسس آئین و قوانین اور مبین مواعظ و عبر ہے اور وہ اللہ ہے اور دوسری "مکتوب الیہ" کہ جو خود بھی ان احکام و قوانین کی مکلف ہے اور دوسروں کے لئے بھی بحیثیت پیغمبر خدا اور رسول اللہ کے مکلف بنانے والی ہے اور وہ محمد ہیں صلی اللہ علیہ وسلم۔ باقی رہے جبرئیل تو وہ محض ذریعہ اور وسیلہ ہیں پیغام رسانی کا اور اس سے زیادہ ان کو علی اور تکلیفی جگہ یہاں حاصل نہیں ہے۔ لہذا ضروری ہوا کہ اس سلسلہ میں اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اور جبرئیل کی شخصیتوں کے اس دوگونہ تعلق میں امتیاز پیدا کرنے کے لئے یہ صورت اختیار کی جائے۔

نیز اس لئے بھی کہ اس اسلوب بیان سے واضح ہو سکے کہ نبی اکرم اگر "نبی امی" ہیں تو یہ وصف صرف اس لئے ان کے لئے باعث صد نازش ہے کہ انھوں نے کائنات ہست و بود میں کسی بڑی سے بڑی ہستی کے سامنے بھی زانوئے ادب تہ نہیں کیا اور ان کو کسی سے بھی شرف تلمذ حاصل نہیں لیکن اس کے باوجود اس مقدس ہستی کا یہ محیر العقول کارنامہ ؎

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست کتب خانۂ چند ملت بشست

محض اس لئے عالم وجود میں آیا کہ آپ نے براہ راست آغوش الٰہی میں تربیت پاکر علم الٰہی سے فیض حاصل کیا ہے اور یہ سب کچھ حق تعالیٰ کے براہ راست فضل و نوال کا صدقہ ہے حتیٰ کہ "الکتاب" کو اگرچہ جبرئیل کے ذریعہ آپ تک پہنچایا گیا ہے تاہم معلم حقیقی خود خدا ہے اور آپ براہ راست متعلم ہیں اور جبرئیل فقط قاصد ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ قاصد کو کیا مطلب کہ "صاحب کتاب" اور "مکتوب الیہ" کے درمیان اس کتاب (مکتوب) کے متعلق کیا راز و نیاز ہیں۔

حروف مقطعات میں سے سورۂ بقرہ کے شروع میں الٓمٓ مسطورہ بالا حقیقت کا اظہار کرنے کے لئے ہے اس کی تصدیق یوں بھی ہو جاتی ہے کہ جب ایک قاری "الکتاب" کی تلاوت کرتا اور اس کے معانی پر غور و خوض سے توجہ دیتا ہے تو سب سے پہلے سورۂ فاتحہ کا نظم و انسجام سامنے آتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ اس سورہ میں تین باتوں کی جانب خصوصیت سے توجہ دلائی گئی ہے ایک خدائے برتر

کی حمد وثنا اور اس کے سامنے عبودیت کا اظہار دوسرے راہِ مستقیم کی تلاش و جستجو اور اس کی طلب اور تیسرے گذشتہ دور کے "منعم علیہم" اور "مغضوب علیہم" کی تقسیم کا ذکر کر کے طلبِ صحیح کا تعین۔ اب اگر بنظرِ غائر ان ہر سہ گانہ امور کا جائزہ لیا جائے تو اس کا نتیجہ اور ثمرہ یہ نکلتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کو پڑھ کر ایک انسان تین حقیقتوں کا طالب نظر آتا ہے کہ ایک اس ہستی کا جو جمیع صفاتِ کمالیہ کی مستجمع ہے اور دوسری ایسی راہ کا جو اس جامع کمالات ہستی کی جانب صحیح راہنمائی کر سکے اور اس راہ کی شروط سے اس ہادی کا جو منعم علیہم کے گروہ میں سے ہو مغضوب علیہم کے گروہ میں سے نہ ہو۔

تو اب ان ہر سہ حقائق کے پیشِ نظر جب ہم تاریخ ادیانِ ملل پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم کو خدا کے پیغاماتِ رشد و ہدایت میں مسلسل تین شخصیتوں کا تعلق اور ان کی وابستگی نمایاں محسوس ہوتی ہے ایک صاحبِ وحی "اللہ" دوسری قاصدِ وحی "فرشتہ جبرئیل" تیسری مخاطبِ وحی "پیغمبر و رسول"

تو جب ایک شخص سورۂ فاتحہ کے اس تصور کو پیشِ نظر لا کر آگے نظر اٹھاتا ہے تو سورۂ بقرہ اس کی نگاہِ منتظر کو تسکین بہم پہنچانے کے لئے الٓمٓ کہہ کر اس پوری حقیقت کا انکشاف کر دیتی ہے جس کے بعد اگر طبع صالح اور فکرِ صحیح کی توفیق حاصل ہے تو قاری خود بخود کلام کی عظمت و فخامت کا معترف ہو کر اس کے امتثال کے لئے سرِ نیاز جھکا دیتا اور خلوص و صداقت کے ساتھ "ذلک الکتاب لا ریب فیہ" پر ایمان و ایقان کے موتی نچھاور کرتا ہے اور حق پژوہی اور حق آگاہی کی راہ سے پکار اٹھتا ہے کہ "صدق اللہ و صدق رسولہ" (باقی آئندہ)

لہ یہ عجیب تاریخی اور لسانی اتفاق ہے کہ ان تمام کتب میں جن کو ان کے ماننے والے آسمانی کتاب کہتے ہیں۔ اسم جلالت یعنی حق تعالیٰ کے علم ذات کے لئے جو لفظ بولا جاتا ہے وہ الف سے ہی شروع ہوتا ہے اور اس طرح حق تعالیٰ کی اولیت و احدیت کا مشترک عقیدہ پیش کرتا ہے چنانچہ عربی میں "الٰہ یا اللہ" عبرانی میں "ایل" سریانی میں "الوہیم" اوستا کی پارسی زبان میں "اہورموزدہ" اور ویدوں کی سنسکرت زبان میں "ایشور" سب الف سے ہی شروع ہوتے ہیں۔